"مجھے میرے والد نے بتایا صیب۔"

"تمہارے والد کو کیسے علم ہوا؟"

"بس ہو گیا صیب۔ علم تو ہو گیا۔ میرے باپ کو سب معلوم تھا۔"

"کیا کرتا تھا تمہارا باپ؟"

"کیا کرے گا صیب۔ کوہستان میں کوئی کام تو ہوتا نہیں۔ پتھر ہی پتھر ہے۔"

"پھر بھی آخر۔" لیڈر نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "کوئی کام تو کرتا ہو گا۔"

"بس ایسا ہی کام کرتا تھا جیسا ہم کرتا ہے۔"

"تم کیا کرتا ہے؟"

"کچھ نہیں صیب۔ ہم کیا کرے گا۔ ہمارے پاس کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔"

"تم لوگ کھیتی باڑی نہیں کرتے؟" لیڈر نے پوچھا۔

کوہستانی نے خشمگیں نگاہوں سے لیڈر کی طرف دیکھا اور پھر چلنے لگا۔

"عجیب آدمی ہے۔ میری بات کا جواب ہی نہیں۔" لیڈر شرمندہ ہو کر بولا۔

"آہستہ بات کرو۔" اعظمی نے کہا۔ "اس کے ہاتھ میں ڈھیلا ہے۔"

وہ تو اس نے کب کا پھینک دیا۔" مفتی نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا اور پھر کوہستانی کے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولا۔ "کیا عمر ہو گی تمہاری خان؟"

"پتہ نہیں صیب۔ ساٹھ اوپر چھ سات سال ہو گی۔"

"شرم کر مفتی۔" اعظمی نے کہا۔ "اپنے سے پانچ سال چھوٹے بچے پر سواری کر رہا ہے۔"

"اُترو۔ اُترو۔ اُترو۔" ہم سب گیدڑوں کی طرح کورس میں چلانے لگے اور کوہستانی حیران ہو کر پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے صیب ہمارا عمر میں غلطی ہو گیا؟"

"نہیں خان نہیں۔ کوئی غلطی نہیں۔" مسعود نے کہا۔ "تمہاری کوئی غلطی نہیں ہماری غلطی ہے۔ ہم زبردستی تمہاری پیٹھ پر سوار ہے، حالانکہ ہم کو تمہارا بوجھ اُٹھانا چاہیے۔"

کوہستانی بیچارا حیران و پریشان راستے میں کھڑا تھا اور مفتی بڑی شرافت کے ساتھ اس کی پیٹھ سے پھسل کر نیچے اُتر رہا تھا۔ مفتی کے اُتر جانے کے بعد لیڈر نے اپنا میوزیک کوہستانی کی

پیٹھ پر لاد دیا اور کہا "یہ اُٹھالو۔ اس کا بوجھ کم ہے۔"

"یعنی اس کی پیٹھ پر کچھ نہ کچھ لادنا ضرور ہے۔" اعظمی نے مصنوعی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا اور اپنا کیمرہ اس کے کندھے پر لٹکا دیا۔

ہم ابھی دس بارہ قدم ہی اُوپر چڑھے ہوں گے کہ مسعود نے بڑی محبت کے ساتھ کہا "یار لیڈر! تمہارا ایس پی جوان تھا یا ادھیڑ عمر کا؟"

"جوان ہی تھا۔" لیڈر نے کہا "چالیس پینتالیس کا ہوگا۔"

"پینتالیس برس کا آدمی جوان ہوتا ہے گدھے؟" عماد نے پُوچھا۔

"بھئی وہ انگریز تھا عماد۔" مُفتی جی نے کہا "انگریز تو پینتالیس برس کی عمر میں جوانی چڑھتا ہے۔ وہ تو اس کا پیک پیریڈ ہوتا ہے۔"

"نہیں مُفتی جی میں نہیں مانتا۔" مسعود نے کہا "انگریز ہو یا دیسی پینتالیس کے بعد اُترنے کا سفر شروع کر دیتا ہے۔"

"اس نے پھر انگریز دیکھے ہی نہیں۔" لیڈر نے فخریہ لہجے میں کہا "اس کے گال تو ایسے تھے جیسے پکے ہوئے آڑو۔"

اعظمی جو اِن سب کی باتیں غور سے سُن رہا تھا سر جھٹک کر بولا "اس لیڈر کو جوتے مارو سالے کو، کیا خوش فہمی سے اپنے صاحب کا ذکر کر رہا ہے، حالانکہ مسعود اس کے ساتھ بڑی صفائی سے ہاتھ کر گیا ہے۔"

"کیا ہاتھ کیا ہے اس نے میرے ساتھ؟" عمر نے غصّے سے پُوچھا۔

"سُنا نہیں تم نے۔" اعظمی نے کہا "اس نے ایس پی کو پھر ڈی ایس پی کہا اور جان بوجھ کر کہا۔"

"کیوں مسعود؟" لیڈر نے ڈانٹ کر پوچھا "یہ سچ کہتا ہے؟"

"بھئی مجھے یاد نہیں اگر میں نے . . ."

اعظمی نے بات کاٹ کر کہا "لو ابھی ایک منٹ پہلے کی کہی ہوئی بات یاد نہیں۔ بڑا مکار ہے بھئی تُو۔ خدا کی پناہ۔ کہہ تو اپنے باپ کو حاضر ناظر جان کر کہ تُو نے ڈی ایس پی نہیں کہا؟"

مسعود نے مسکرا کہا "میں نے جان بُوجھ کر نہیں کہا سہواً میرے منہ سے ڈی ایس پی نکل گیا ہو تو

اس کی قسم نہیں کھاتا۔"

"اور سہواً تیرے مُنہ سے ایس پی کیوں نہ نکلا؟" مُفتی نے پُوچھا۔

"وہ تو اس کے مُنہ سے کبھی نہیں نکلے گا۔" اعظمی نے کہا۔ "بے عزتی جو مقصود ہے لیڈر کی۔ اس کو مار لیڈر، اس نے جان بوجھ کر اس کا رُتبہ گرایا ہے۔"

"اس کا رُتبہ کون گرا سکتا ہے۔" لیڈر نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "وہ تو آئی جی پولیس ہو کر ریٹائر ہُوا تھا۔"

"آئے ہائے اسے ریٹائر ہوتے بھی دیکھ لیا بوڑھے کو۔" اعظمی نے شوشہ چھوڑا۔

"مَیں نے تو بہت دیکھا۔" لیڈر نے کہا۔ "یہاں آ کر خبر سُنی تھی پاکستان میں... لیکن وہ بوڑھا کب تھا۔" اس نے اپنی سوٹی زور سے اعظمی کے بازو پر ماری اور ہنس کر پرے ہو گیا۔

عمّاد نے زور کی ہانک لگائی اور کہا۔ "شاہ جی اب کہاں ہو اس وقت..."

مَیں نے کہا۔ "کہیں نہیں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"باہر کے سفر میں تو ہمارے ساتھ ہو شاہ جی۔" مُفتی نے کہا۔ "لیکن اندر کے سفر میں کہاں تک پہنچ گئے ہو؟"

"اندر کے سفر میں۔" مَیں نے اعتراف کرتے ہُوئے کہا۔ "کچھ خاص دُور نہیں اپنے پروفوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"کس کے بارے میں؟" اعظمی نے پُوچھا۔

"پروفوں کے بارے میں۔" مَیں نے آہستگی سے جواب دیا۔ "جب مَیں دفتر سے چھٹی لے کر ادھر آ رہا تھا تو میری میز پر تاریخِ فیروز شاہی کے پروف آ رہے تھے۔"

"یہ تاریخِ فیروز شاہی کیا چیز ہے؟" عمّاد کی تاریخی رگ پھڑکی۔

مَیں نے کہا۔ "تاریخِ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی کی تصنیف ہے اور ہم نے حال ہی میں فارسی سے اس کا اُردو ترجمہ کروایا ہے۔ یہ تاریخ بلبن کے عہدِ حکومت سے جو ۱۲۶۶ء سے شروع ہوتا ہے سُلطان فیروز شاہ کے ابتدائی دَور تک یعنی ۱۳۵۸ء تک کے زمانے پر محیط ہے۔ گویا یہ بانوے سال کی مُدت ہے جس کے حالات اور واقعات کی ضیاء الدین برنی ایک ہم عصر کی

حیثیت سے گواہی دیتا ہے۔

"مَیں نے تو نہیں دیکھی یہ تاریخ۔ عمّاد نے سر ہلا کر کہا۔ حالانکہ پُرانی پُرانی سب تاریخیں میری نظر سے گزر چکی ہیں۔"

"آپ نے غور نہیں فرمایا۔ اعظمی نے کہا۔ شاہ صاحب بتا رہے تھے کہ یہ تاریخ فارسی زبان میں ہے اور فارسی بڑے بڑے حکیموں کے قابو میں نہیں آتی۔ آپ تو پھر سلطنتِ خداداد کے ایک خداداد قسم کے انجینئر ہیں۔"

"لیکن اس وقت اور ایسے خوشگوار موسم میں پردفوں کا یاد آنا کوئی صحت مند بات نہیں۔" مسعود نے کہا۔

مَیں نے کہا۔ "اصل میں آپ ابھی جو باتیں کر رہے تھے امرو پرستی اور ڈی ایس پی وغیرہ کی اُن سے میرا خیال ادھر منتقل ہو گیا ہے۔"

"دیکھا دیکھا۔" اعظمی چلّایا۔ "شاہ صاحب بھی اس کو ڈی ایس پی بتلا رہے ہیں۔"

"ان سب کو بکنے دو اعظمی۔" لیڈر نے کہا۔ "یہ جلتے ہیں۔"

"لیکن مَیں سمجھا نہیں۔" مُفتی نے اپنا مُچڑا ہُوا دامن جھٹک کر کہا۔ "ہماری گفتگو سے تمہارے پردفوں کا تعلق کیسے پیدا ہو گیا؟"

مَیں نے کہا۔ "مُفتی جی جب پروف ریڈر کی طرف سے پروف میری میز پر پہنچے، تو ان پر جا بجا سُرخ نشان لگے تھے اور سارے صفحے گولوں، کانٹوں اور تیروں سے اَٹے ہوئے تھے۔ مَیں نے پریس کو اس کے تساہل پر سرزنش کی غرض سے ایک نوٹ لکھنا چاہا اور ان پردفوں کو بغور دیکھنے لگا۔ تاریخِ فیروز شاہی کا یہ باب سُلطان قطب الدین مبارک شاہ کے دورِ حکومت سے تعلق رکھتا تھا۔"

"کیا بات تھی قطب الدین کی۔ لیڈر نے سر ہلا کر کہا۔ یہ اس کی لاٹھ تو اس عظیم مسجد کا ایک مینار بھی۔ وہ جو بنانے والا تھا۔ اگر خدا کو منظور ہوتا۔ ۔ ۔"

لیکن عمّاد نے اس کی بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور چڑ کر بولا۔ "او گدھے یہ قطب الدین ایبک کا ذکر نہیں ہو رہا۔ قطب الدین مبارک شاہ کا ذکر ہے جو علاؤ الدین خلجی کے بعد ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تھا۔"

عمّاد کی یہ بات سن کر سب خاموش ہو گئے۔ کیونکہ علاؤالدین خلجی اور اس کے بعد کے دَور کی پلیس منٹ ان کے ذہنوں میں نہ ہو رہی تھی۔

"ہاں جی۔" عمّاد نے کہا۔ "قطب الدین مبارک شاہ کے دَور کی کیا خصوصیت تھی؟"

"کچھ نہیں۔" مَیں نے آہستگی سے کہا۔ "اس کے بعد کا دَور مسلمانانِ ہند کے لیے ایک عبرت کا دَور تھا اور یہ وہ وقت تھا کہ اگر تائیدِ غیبی شاملِ حال نہ ہوتی تو اس وقت برِصغیر میں ایک بھی مُسلمان نہ ہوتا اور یہ جو پاکستان ہے جو کاغان اور اس پہاڑ پر جو ہمارے وجود جھیل کی طرف رواں دواں ہیں اور جو اذانیں سُنائی دیتی ہیں اور جو درود و سلام محبوبؐ پر بھیجا جاتا ہے۔ ان سب کا کوئی وجود نہ ہوتا اور اگر برِصغیر میں دیپال پُور نہ ہوتا تو نہ یہاں اِسلام ہوتا، نہ پاکستان ہوتا نہ مسلمان ہوتے۔"

"یہ اپنا دیپال پور منٹگمری والا؟" مُفتی جی نے پُوچھا۔

"ہاں جی۔" مَیں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ "اس قصبے کو حقیر نہ جانیے یہ برِصغیر میں اسلام کی کل کی حیثیت رکھتا ہے جیسے اولیاؤں میں قطب الاقطاب ہوتا ہے۔"

"یہ بات کچھ صوفیا کے رنگ کی ہو گئی۔" اعظمی نے کہا۔ "تمہارے لیے غور کا مقام ہے مُفتی۔"

مُفتی نے کہا۔ "بکواس مت کرا دکُتے۔"

مَیں نے کہا۔ "اُس عہد کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت گھُومتا رہتا ہے اور مجھے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ مَیں قصرِ ہزار ستون جو سُلطان قطبُ الدین مبارک شاہ کا محل تھا اس کا ایک دربان ہوں۔ میرے ہاتھ میں نیزہ، سَر پر خود، بازو پر سُلطان کا چرمی نشان اور گلے میں اس کی غلامی کا پٹہ ہے۔ مَیں قصرِ ہزار ستون کے اندر باہر آزادی سے گھُوم سکتا ہوں۔ مجھے دارالحکومت دہلی کے کوچہ و بازار کی ایک ایک خبر ہے اور قصرِ ہزار ستون کے اندر ہونے والی بات کا علم ہے۔ مَیں قصر کے اندر کی عشرتوں اور قصر کے باہر کی سازشوں سے بخوبی واقف ہوں۔"

اعظمی نے کہا۔ "یہ تو راوی نمبر ایک ہُوا، اب راوی نمبر دو بولے۔"

"بس اب بکواس بند کرو۔" سب نے یک زبان ہو کر اعظمی کو ٹوکا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گئے

"ہاں شاہ جی۔" عمّاد کا تجسّس اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔

مَیں نے کہا۔ "مجھے ضیاءالدین برنی کے اصل الفاظ تو یاد نہیں لیکن میرے حافظے پر اس کی

عبارت کا ہر پیراگراف مرتسم ہے اور میں اپنی فوٹوگرافک میموری سے متن کی اچٹتی ہوئی عبارتیں آپ کے سامنے پیش کرسکتا ہوں۔ یہ باب مجھے کئی ہفتے تک ہانٹ کرتا رہا ہے:

"اب آگے بھی چلو۔" مسعود نے چڑ کر کہا: "ہمیں بغیر واقعہ کے ہی ہانٹ کرا رہے ہو۔"

میں نے کہا: "جب سلطان قطب الدین تخت پر بیٹھا تو ہوا پرستی سے مغلوب ہو کر عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا۔ اس نے تخت نشینی کے دن ہی حکم دیا کہ سلطان علاؤالدین کے زمانے کے تمام قیدیوں کو جن کی تعداد سترہ اٹھارہ ہزار تھی رہا کر دیا جائے۔ اپنی تخت نشینی کے شکرانے کے طور پر اس نے سارے لشکریوں کو چھ ماہ کی تنخواہ انعام کے طریقے پر دی اور ملوک اور اُمرا کی تنخواہیں بڑھا دیں۔ بہت سے علاقے اور زمین جو علاؤالدین کے زمانے میں شاہی جاگیر میں داخل ہو گئی تھیں قطب الدین نے مالکوں کو واگزار کر دیں۔ اب گلیوں اور کوچوں میں گھروں کے اندر اور باہر سونا اور چاندی دکھائی دینے لگے اور لوگوں کو اس خوف اور ہراس سے نجات مل گئی کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، یہ کہو اور یہ نہ کہو، یہ کھاؤ اور یہ نہ کھاؤ۔ اس طرح بچو اور اس طرح سے نہ بچو؛ چنانچہ مختلف تفریحات، عیش و عشرت اور شاہد و شراب اور غلام اور لونڈے از سرِ نو نظر آنے لگے۔ زمانے کا کاروبار بدل گیا۔ اکثر لوگوں نے توبہ توڑ دی۔ نیکی اور پارسائی کو خیرباد کہہ دیا۔ عبادات کو خیرباد کہہ دیا۔ عبادات میں کمی آ گئی۔ ہر کوچے اور ہر بازار میں نئے نئے لونڈے نظر آنے لگے۔ سب خوب رُو اور نازک اندام گانے والے دُور دُور سے سمٹ کر شہر میں آنے لگے۔ اس وقت کم عمر غلام خوبصورت خواجہ سرا اور حسین کنیز کی قیمت ہزار اور دو ہزار تنکے تک پہنچ گئی۔

چونکہ علاؤالدین خلجی سخت گیر آدمی تھا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر موت کی سزا دے دیا کرتا تھا، اس لیے اس کے عہد میں اونچے اونچے عہدوں والے اور اعلیٰ مرتبوں والے آنکھ میں ڈالے پر بھی نہ رڑکتے تھے۔ غریب آرام کی زندگی بسر کرتے تھے اور صاحبِ حیثیت ہر وقت خوفزدہ رہتے تھے۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ پر علاؤالدین خلجی کے مزاج کا ایسا ردِ عمل ہوا کہ اس نے ہر شخص کو ہر طرح کی آزادی عطا کر دی۔ اس کی اس چھوٹ کا سب سے پہلا مضر اثر تاجروں اور سوداگروں پر ہوا۔ اب وہ اپنا سامان اپنی مرضی کے مطابق فروخت کرنے لگے اور مکاری اور دھوکہ دہی سے لوگوں کو حسبِ مراد لوٹنے لگے۔ رشوت، رسوخ اور خیانت کے دروازے کھل گئے۔ محصولوں کی کمی کی وجہ سے مزدوروں کی زندگی اچھی گزرنے لگی اور ان کے پاس دولت کے انبار

جمع ہونے شروع ہو گئے۔ وہ ہندو جو کھیتوں سے گری پڑی بالیاں اکٹھی کر کے اپنا پیٹ پالا کرتے تھے۔ کبھی ٹھیک سے کپڑے نہ پہنتے تھے۔ زمین پر سوتے تھے۔ اب باریک کپڑے پہننے لگے اور تیر کمان سجا کر گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ مسلمانوں میں فسق و فجور پیدا ہو گیا اور ہندوؤں میں تفخر اور سرکشی کا مادہ پیدا ہونے لگا۔

برنی کہتا ہے کہ سلطان قطب الدین کو اپنی چار سال اور چار ماہ کی مدتِ حکومت میں شراب پینے، گانا سننے، عیش و عشرت میں وقت گزارنے اور نفس پرستی کی داد دینے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔ اگر اس زمانے میں مغلوں کا لشکر آجاتا یا ملک کے کسی بڑے حصے میں بغاوت ہو جاتی یا کوئی اور فتنہ کھڑا ہوتا، تو اس کی غفلت بے خبری عیاشی اور بے پروائی دارالحکومت دلی میں کیا رنگ لاتی، لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اس کے عہد میں نہ مہلک قحط پڑا، نہ مغلوں کے حملے کی مصیبت آئی، نہ کوئی آسمانی بلا نازل ہوئی، نہ کوئی بغاوت یا سرکشی یا عظیم فتنہ برپا ہوا۔

اس کے عہد میں گجرات اور دیوگیر میں بغاوت کا ایک شدید طوفان اٹھا لیکن اس طوفان کے ایک ہی دن میں فرو ہو جانے کی وجہ سے اس میں خود سری اور بے مہری کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ دیوگیر اور گجرات میں بغاوت کے سرغنوں کی بیخ کنی کے بعد سلطان جب دلی پہنچا، تو جوانی، حکومت، مال اور دولت، ہاتھی، گھوڑوں اور ہوا پرستی اور شراب کی مستیوں پر فتح و نصرت، ضبط و نظم، استقامت اور امرائے قدیم کی اطاعت و فرمانبرداری نے اس کو مزید بے باک، لاپروا، ظالم اور جابر بنا دیا۔ وہ اپنے مقربوں اور قریب رہنے والوں سے فحش کلامی کرتا ان کو گالیاں دیتا اور بھرے دربار میں ان کی تذلیل کرتا۔ اس کے گرد خام طبع نو دولتے، ناتجربہ کار، مغرور اور ظالم نوجوان محرموں اور مشیروں کے روپ میں جمع ہو گئے۔ شرم و حیا اس کی آنکھوں سے جاتی رہی۔ وہ عورتوں کے کپڑے اور زیورات پہن کر مجمع میں آجاتا اور لوگوں سے ٹھٹھول کرتا۔ عین الملک ملتانی کو جو اس کے عہد کا امیر الامرا تھا اور تلک قرابیگ کو جو چودہ عہدے رکھتا تھا مسخری کرتا اور فاحشہ عورتوں سے ان کو گندی گالیاں دلواتا۔ امرا اور شرفا کی محفلوں کے لیے اس نے گجرات سے توبہ نامی ایک مسخرے کو بلا رکھا تھا جو بھری محفل میں آکر ملکوں اور دوسرے امیروں کو بیوی اور ماں کی گالیاں دیتا تھا۔ یہ مسخرہ اپنے پیشاب کی جگہ کو آگے کر کے آجاتا اور امرا کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتا اور ہوا خارج کرتا۔ بعض اوقات بالکل برہنہ ہو کر مجمع عام میں آجاتا اور فحش کلامی شروع کر دیتا۔"

اِتنے میں ایک امریکن عورت بریزیئر اور سکرٹ پہنے پہاڑی کی اوٹ سے نمودار ہوئی۔ وہ جھیل دیکھ کر واپس آ رہی تھی اور اس نے اپنا پیلا سویٹر کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ جب وہ ہمارے قریب سے گزر گئی تو ہم سب گھوم کر اس کی برہنہ کمر دیکھنے لگے۔ ڈھلوان کی وجہ سے اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے تھے اور وہ بریکیں لگا لگا کر چل رہی تھی۔ اس بریک بندی کی وجہ سے اس کی دونوں بکھیوں میں باری باری بھنور بنتے تھے اور باری باری پُر ہو رہے تھے۔

ہم نے دیکھا لیڈر ایک جھاڑی کے قریب سے نیچے اُترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مسعود نے اُونچی آواز میں کہا: "او لیڈر!"

تو عماد نے قہقہہ مار کر ہانک لگائی: "اوئے توبہ نامی مسخرے اتنی دُور پیشاب کرنے کیوں جا رہا ہے؟"

ہم لیڈر کے انتظار میں کچھ دیر وہاں رُکے رہے۔ اعظمی پتھروں کے پیچھے اور چٹانوں کی دراڑوں میں جنگلی پھول تلاش کرتا رہا اور مسعود ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر اپنی رانوں پر مکیاں مارتا رہا۔ مسعود جب چلتا ہے تو ایک طرف کو جھولا کھاتا ہے۔ اوائل شباب ہی سے اس کا سینٹر آؤٹ ہے اور اس کے ٹائی راڈ پر بڑی خطرناک گھاسیں پڑ گئی ہیں۔ یوں تو اس کی صحت ہم سب سے اچھی ہے۔ اکہرا بدن، کھنچا ہوا چہرہ، مضبوط رگ و ریشے، لیکن ہم سب اندر ہی اندر جانتے ہیں کہ جس دن اس کا ٹائی راڈ کھل گیا وہ ہمارے درمیان نہیں رہے گا اور پھر ہم کو اگلا سفر اس کے بغیر ہی کرنا ہوگا۔ اسی طرح آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے سارے ساتھی اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گے اور ہمارے بعد صرف راستے اور راستوں کے جنگلی پھول رہ جائیں گے۔

جب لیڈر اپنی چھڑی گھماتا ہوا واپس آ گیا تو ہم سب اس کے خوف سے آگے چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا: "ابھی کچھ دیر یہاں قیام کریں گے اور پھر آگے چلیں گے۔"

"یہ کیوں؟" مفتی نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ ابھی اس بکواسی کا قصہ ختم نہیں ہوا۔"

"عماد نے کہا: "قصہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔"

"قصہ خواں نہ بھی چلے" اعظمی نے کہا "تو بھی قصہ ہمارے ساتھ چلتا رہے گا۔ دیکھو ناں قصہ خوانی بازار سارا دن چلتا رہتا ہے حالانکہ کوئی بھی قصہ خواں وہاں موجود نہیں ہوتا"

"لیکن بھائیو" مسعود نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "مسافت لمبی ہے اور وقت کم ہے اور ہمیں واپس بھی لوٹنا ہے"

"سُنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں" لیڈر کڑک کر بولا "ابھی تھوڑی دیر رُکو۔ پھر میں لیٹ خود ہی نکال لوں گا"

اس لیٹ نکالنے کے خوف سے سب کے چہرے لٹک گئے۔

مسعود پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ عماد نے اپنے لیے ایک پتھر ڈھونڈ لیا۔ اعظمی نے چٹان کے ساتھ ٹیک لگائی۔ مُفتی اور اس کی سواری راستے میں چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔ لیڈر اور میں کمریں جوڑ کر ایک اور پتھر پر بیٹھ گئے اور عماد نے اپنے بوٹ کی ٹو پر چھڑی مارتے ہوئے کہا:

"شاہ جی دیپالپور میں آپ کی زمین تو نہیں"؟

میں نے کہا "نہیں"۔

"تو پھر آپ اس قصبے کی اتنی تعریف کیوں کر رہے ہیں"؟

"میں اس کی تاریخی اہمیت کا ذکر کر رہا ہوں بھائی جی۔ اس وقت کے قصبے کی تعریف نہیں کر رہا"

"یعنی تاریخی اعتبار سے یہ دہلی، سورت، دکھن، سامانہ، لکھنوتی اور بنگالہ سے بھی اہم ہے"

"بات ہوئی ناں" اعظمی چہک کر بولا "تاریخی مطالعہ اس کو کہتے ہیں۔ تم سالا لوگ اکیلے دیپالپور کو لیے بیٹھے ہو"

"اصل میں یہ ذات کا خاص سکریٹ رائٹر ہے" اشفاق احمد" مسعود ہنس کر بولا "اور جان بُوجھ کر مقامی قصبوں کو شریف الاصل اور اعلیٰ درجے کے ثقافتی مراکز پر ترجیح دے رہا ہے۔ یہ بڑا متعصب ہے"

"متعصب بھی ہے متعنّی بھی" مُفتی نے سنگریزوں سے کھیلتے ہوئے کہا "یہ دیپالپور کے باجرے سے چڑیاں اُڑانے والی غلیل لے کر ہندوستان کا لشکر فتح کرنا چاہتا ہے"

"خاموش!" لیڈر نے کڑک کر کہا۔ "ہمیں قصہ سُننے دو۔ ہاں بھئی!"

میں نے کہا۔ "ہاں بھئی کیا؟"

لیڈر نے کہا۔ "وہیں سے بیان کرو جہاں تم نے یہ قصہ ابھی چھوڑا تھا۔"

"بھلا کس کا قصہ تھا لیڈر؟" اعظمی نے شرارت سے پُوچھا تو لیڈر کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ اس نے قہر آلُود نگاہوں سے اعظمی کو دیکھا اور کہا۔ "قطب الدین مبارک شاہ کا، خلجی خاندان کے آخری بادشاہ کا۔ اس کے بعد تغلق بادشاہوں کا دَور شروع ہوتا ہے۔ یہ وہی تغلق بادشاہ تھے جنہوں نے اپنے دَور میں . . ."

"بس بس بس" عماد نے تقریر کاٹ کر کہا۔ "ہم تاریخ میں بھی تمہاری لیڈری کے قائل ہو گئے، لیکن اس وقت ایک دوسرا معاملہ درپیش ہے اس سے نمٹ لینے دو . . . . . ہاں شاہ جی!"

میں نے ایک تابع فرمان، اصل اور شریف مصاحب کی طرح کہنا شروع کیا۔ دوستو! یُوں تو بہت سے بادشاہوں کی زندگیاں فسق و فجور اور لہو و لعب میں گزریں اور ان کے مظالم سے بستیوں کے در و دیوار خونِ ناحق سے رنگین ہوتے رہے اور اس کے باوجُود ان کے عہد کی وسعتوں میں کمی نہ ہوئی اور ان کے ادوار کئی کئی سالوں پر محیط رہے، لیکن مردانِ درویش اور مقربانِ الٰہی کی بے ادبی کرنے والے بادشاہوں کے اوقات ان پر جلد ہی تنگ ہو گئے اور تاریخ کے اوراق ان پر بڑی تیزی کے ساتھ سمٹ گئے۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ پر جب فضلِ ایزدی کے دروازے بند ہوئے، تو اُس نے اچانک حضرت نظام الدینؒ اولیاء کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہ اعلانیہ اُن کی مخالفت کرتا اور دربار سے منسلک ملوک کو منع کرتا کہ شیخ کی زیارت کے لیے ہرگز نہ جایا کریں۔ بارہا مستی کی حالت میں انتہائی بے باکی اور بے شرمی کے ساتھ کہا کرتا کہ جو بھی نظام الدینؒ اولیاء کا سر کاٹ کر ہمارے حضور میں لائے گا اُس کو سونے کے ہزار تنکے دُوں گا اور اُس کا مرتبہ بلند کروں گا۔ ایک مرتبہ کسی بزرگ کے سوئم پر سلطان قطب الدین کا حضرت نظام الدینؒ اولیاء سے آمنا سامنا بھی ہُوا، لیکن اُس نے نہ صرف شیخ کا واجبی احترام کرنے سے احتراز کیا، بلکہ اُن کے سلام تک کا جواب نہ دیا اور

سب کے سامنے عدم التفاتی کا مظاہرہ کیا۔

خسرو خاں جو سلطان کی ناک کا بال اور اُس کی آنکھ کا تارا تھا دراصل ایک مرتد تھا اور ہندوستان سے مسلمانوں کے خاتمے اور علائی خاندان کو تاراج کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ ایک برادو بچہ تھا اور اس کا خاندان اور قبیلہ بہت وسیع تھا۔

"برادو کیا؟" لیڈر نے پوچھا۔

مَیں نے کہا: "مجھے اس قوم اور نسل کے بارے میں پوری تفصیلات دستیاب نہیں ہوئیں لیکن جہاں تک معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ یہ قوم ساؤتھ انڈیا میں بستی تھی۔ اور کول، دراوڑ اور بھیلوں سے ذرا اُونچے رتبے کی تھی۔ ان کا عام مندروں میں داخلہ ممنوع نہ تھا اور یہ اعلےٰ پایہ کے ہندوؤں اور برہمنوں کے ساتھ واجبی سا میل جول رکھ سکتی تھی۔ کاماسوترا میں جنوبی ہندوستان کے جن لوگوں کا مذکور ہے کہ وہ جنسی اور جسمانی لذت فراہم کرنے میں اپنا ثانی نہیں شاید وہ اسی قوم برادو سے تعلق رکھتے تھے۔ گجرات، معبر اور دیوگیر میں شاہی مراعات حاصل کرنے کے لیے اس قوم کے لوگ بظاہر مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے نام بھی تبدیل کر لیے تھے۔ خسرو خاں کا اپنا نام حسن تھا۔ اس کے ماموں رانڈھول نے اپنا نام حسام الدین رکھا ہوا تھا اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے ظفر خاں نائب گجرات کے قتل کے بعد اُس کو گجرات کا حاکم بنا دیا تھا۔ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ خسرو خاں کا یہ ماموں ایک خبیث اور بدکردار برادو بچہ تھا جو طاقت کے نشے میں بڑا منہ زور اور بے حد بے باک ہو گیا تھا اور مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کے لیے یہ ولدالزنا مُرتد ہو گیا تھا۔

"اُس نے گجرات میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو جمع کیا اور گجرات کے سب مشہور برادوں کو اپنے ساتھ کر کے عَلَمِ بغاوت بلند کیا اور فتنہ بپا کر دیا، لیکن امرائے گجرات قوت و شوکت اور حشم و خدم رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اس کو گرفتار کر کے قید کر لیا اور سلطان قطب الدین کے پاس بھیج دیا۔ سلطان قطب الدین جو اس کے بھانجے خسرو خاں پر دل و جان سے فریفتہ تھا اور اُس کی ایک ایک لپک اور ایک ایک مشک پر مَر مَر جاتا تھا، رانڈھول کو حکومتِ علائی کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کرنے پر یہ سزا دی کہ اُس کے مُنہ پر ایک طمانچہ مارا اور اُس کی رہائی کے احکام صادر

فرمادیئے اور اُس کو اپنی درگاہ کا مقرب بنالیا۔ گجرات کے امراء نے جب یہ سُنا تو وہ ڈر گئے اور سلطان کی طرف سے اُن کے دِلوں میں خوف اور نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔

"جُوں جُوں وقت گزرتا گیا سلطان قطب الدین خسرو خاں کی آتشِ عشق میں اور دیوانہ ہوتا گیا۔ وہ ہر وقت اُس کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا اور اُس کے ایک ایک نخرے پر جھُوم جھُوم جاتا۔ خلوت کے لمحوں میں خسرو خاں اپنے ۔۔۔ ایک مخالف کا ذکر سلطان سے کر کے یا تو اُسے قتل کروا دیتا یا علاقہ بدر کروا دیتا۔ مخالفین کو اس طرح ختم کرنے کے بعد خسرو خاں اپنی ساری قوّت کے ساتھ بغاوت کے کام میں لگ گیا۔ گو اُس نے کچھ علائی سرداروں کو جو سلطان سے ذاتی رنجش رکھتے تھے اپنے ساتھ ملالیا۔ پھر بھی اُس کو اپنے گرد ایک ایسے حصار کی ضرورت تھی جو اُس کی قوم کے سرفروش جانبازوں پر مشتمل ہو، چنانچہ ایک دن اُس نے سلطان سے دست بستہ عرض کی کہ مَیں خداوند کریم کی حکومت ہی میں پلا بڑھا ہوں اور حضور کے زیرِ سایہ ہی زندگی گزار رہا ہوں تمام مملوک و امراء کے عزیز و اقارب اور خاندان دِلّی میں موجود ہیں، لیکن میرا کوئی نہیں اگر اجازت ہو تو مَیں اپنے ماموں کو بہل وال اور گجرات کے علاقوں میں بھیج دُوں کہ میرے چند عزیزوں اور رشتہ داروں کو عنایاتِ سُلطانی کی اُمید دلا کر یہاں لے آئے۔ اُن کی بستی بسادی جائے اور مَیں جب سلطان سے اجازت پاؤں تو کبھی کبھار اُن کو جا کر مِل آیا کروں۔ سلطان قطب الدین نے مستی اور شہوت کی حالت میں اُس کو دل و جان سے اس بات کی اجازت دے دی۔ اس ترکیب سے اُس نے مشہور مشہور برادوں کو گجرات سے اپنے پاس بُلوالیا اور اُن کو روپے، گھوڑے، آلاتِ حرب، جاگیریں اور خلعتیں عطا کرنے لگا اور اُن کی قوّت اور شوکت میں اضافہ کرتا رہا۔

"اُن دنوں میں خسرو خاں بغاوت کے سلسلہ وار منصوبے بناتا رہا اور اُس کے برادر رشتہ دار اُن منصوبوں میں برابر کے شریک ہوتے رہے۔ پہلے انہوں نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ جب سلطان شکار کی غرض سے سرسادہ کے مقام پر جائے تو برادر لوگ اس کے ہم رکاب چلیں اور اُس کی حضوری کا دم بھرتے جائیں۔ شکارگاہ میں عین اُس وقت جب شکار پر نرغہ ڈالا جائے تو سلطان کو قتل کر دیا جائے، لیکن چند دوسرے باغیوں نے اپنے ساتھیوں کو منع کر دیا کہ اگر ہم نے سلطان

کو شکارگاہ میں قتل کر دیا تو ممکن ہے سارا لشکر فوراً اکٹھا ہو جائے اور ہم میں سے ہر ایک کو شکار کے میدان میں ہی قتل کر دیا جائے۔ پھر ایک غوغا ہو اور ہمارے خلاف جنگ شروع ہو جائے۔ ایسی حالت میں وہ برادو لوگ کہاں جا سکیں گے جن کو گجرات سے بُلایا ہے۔ وہ تو سارے تہ تیغ ہو جائیں گے اور ہماری سازش دھری رہ جائے گی؛ چنانچہ یہی طے پایا کہ سُلطان کو اُس کے محل قصرِ ہزار ستون کی بالائی منزل میں قتل کیا جائے اور اُسی محل میں پناہ لی جائے۔ ملوک کو اُن کے گھروں سے بُلایا جائے اگر وہ ہمارا ساتھ دیں تو خوب، نہیں تو انہیں بھی وہیں قتل کر دیا جائے۔

سلطان سرسادہ کی شکارگاہ سے جلدی واپس آگیا اور شہر میں آکر پھر عیش و عشرت میں غرق ہو گیا۔ ایک روز خسرو خاں نے ایسی حالت میں جو اُس کے اور سلطان کے درمیان گزرا کرتی تھی، سلطان سے کہا کہ میں ساری رات آپ کے پاس گزار کر صبح کے وقت جاتا ہوں۔ اس وقت محل کے دروازوں میں قفل لگے ہوتے ہیں؛ چنانچہ میرے وہ عزیز جو اپنا وطن چھوڑ کر، میری خاطر یہاں آ گئے ہیں نہ تو میرے پاس آ سکتے ہیں اور نہ مجھ سے مل سکتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ عقبی دروازے کی کنجی میرے آدمیوں کو دے دی جائے تاکہ جب بھی میرے عزیز و اقارب چاہیں اس دروازے سے محل میں داخل ہو کر میرے پاس پہنچ جائیں۔ سلطان نے جو مستی کی وجہ سے مدہوش اور غافل تھا حکم دے دیا کہ عقبی دروازے کی چابیاں خسرو خاں کے رشتہ داروں کو دے دی جائیں تاکہ وہ جب چاہیں اپنے عزیز سے ملاقات کر لیا کریں اور ان کے درمیان کوئی رخنہ حائل نہ ہو۔

سُلطان کے اِس حکم کے بعد ہر شب، ایک پہر یا دو پہر رات گزرنے پر، تین چار سو ہتھیار بند برادو محل کے عقبی دروازے سے داخل ہوتے اور اِدھر اُدھر گھومتے رہتے۔ محل کے پہرے داران ہتھیار بند برادوں کو قصرِ ہزار ستون میں اس طرح گھومتے پھرتے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئے۔ پھر اُن میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ آج یا کل خسرو خاں بغاوت کر دے گا، لیکن سلطان کی بدمزاجی اور جبروت کے سامنے کُھل کر بات کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ تجربہ کار اور دانشمند بڑے بُزرگ آپس میں کہتے تھے کہ جس طرح سلطان جلال الدین کو دولت کی ہوس اور روپے کے لالچ نے اندھا کر دیا تھا اِس طرح سلطان قطب الدین کو شہوت کے غلبے اور مستی

اور بے خبری نے اندھا کر دیا ہے۔ کسی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سلطان قطب الدین سے کہتا کہ خسرو خاں کی بغاوت کا منصوبہ گلے تک پہنچ گیا ہے۔ ان براؤوں میں سے جو ہر رات ہتھیار بند ہو کر محل کے اندر آتے ہیں کسی ایک کو پکڑوا کر تحقیق کر لے تاکہ وہ خسرو خاں کے ارادوں کا حال تیرے سامنے بیان کر دے۔ محل کے تمام بزرگ خسرو خاں کی بغاوت سے متعلق مشورے سنتے تھے اور براؤوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور اندر ہی اندر غصہ کھاتے تھے، لیکن سلطان کے بے ہودہ برتاؤ سے ڈرتے تھے کیونکہ اس میں اپنی جان کا زیاں تھا۔

آخر ایک روز سلطان کے محل کے کلید بردار قاضی ضیاء الدین نے دل کڑا کر کے سلطان سے صاف صاف اور کھل کر کہہ دیا کہ خسرو خاں کے گھر میں ہر روز رات کے وقت براؤ لوگ جمع ہوتے ہیں اور ہتھیاروں سے لیس اور مستعد رہتے ہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ خسرو خاں بغاوت کی فکر میں ہے اور حضور کی جان کے درپے ہے۔ میں چونکہ ایک اعتبار سے سلطانِ عالی کا استاد بھی ہوں کہ میں نے آپ کو خطاطی سکھائی ہے اور پھر میں بادشاہ کے کرم پر اعتماد رکھتا ہوں اس لیے میں جو کچھ سنتا اور دیکھتا ہوں، عرض کر دیتا ہوں۔ اگر خداوندِ عالم اس معاملے کی تفتیش کریں کہ اس کا تعلق خداوندِ عالم کی جان سے ہے تو حضور کی حکومت کو کیا نقصان پہنچے گا اور خسرو خاں کی محبت میں کیا کمی آجائے گی۔ اگر تفتیش کے بعد کچھ نہ نکلے اور ہم غلاموں کا وہم غلط ثابت ہو تو خسرو خاں پر سلطان کو ہزار گنا زیادہ اعتماد ہو جانا چاہیئے اور اگر تفتیش سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو سلطان کی جان محفوظ رہ جائے گی اور ہمیں اپنی نمک حلالی پر فخر ہوگا۔

"قاضی ضیاء الدین کلید بردار کی یہ بات سن کر سلطان قطب الدین سخت خفا ہوا اور اس کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ عین اسی وقت خسرو خاں بھی وہاں پہنچ گیا اور بدنصیب سلطان نے جو حلق تک خواہشاتِ نفسانی میں ڈوبا ہوا تھا، قاضی ضیاء الدین کی ایک ایک بات خسرو خاں کو سنا دی اور قاضی کو ذلیل و رسوا کر کے وہاں سے چلتا کیا۔ ضیاالدین برنی لکھتا ہے کہ بدکردار خسرو خاں، مردوں کے نیچے لیٹنے والا اور ناجوان مردوں کی اولاد یہ باتیں سن کر رونے اور آنسو بہانے لگا اور فرضی آہ و بکا کرنے لگا۔ اس نے سلطان سے کہا کہ چونکہ خداوندِ عالم مجھ پر حد درجہ

مہربان ہیں اور دوسرے ملوک اور امرار سے میرا مرتبہ بلند کر دیا ہے اس لیے سب بزرگان مملکت اور مقربین درگاہِ سلطانی مجھ سے جلنے لگے ہیں اور میری جان کے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ مجھ کو قتل کروا دیں۔ سلطان قطب الدین پر اُس نازک بدن برادو بچہ کے نازآمیز گریہ وزاری سے شہوت کا تازہ جنون سوار ہو گیا۔ اُس نے اُس کو بغل میں لے کر چمٹایا۔ چند بوسے اُس کے لبوں کے لیے اور نیچے گرا لیا اور پھر کیا ہو کچھ کیا۔ اس اثنا میں جب کہ جان پر بازی لگانا آسان ہو جاتا ہے، سلطان نے اُس سے کہا کہ اگر سارا جہان زیر و زبر ہو جائے اور میرے سارے مقربین یک زبان ہو کر تیرے خلاف مجھ سے کہیں تب بھی میں تجھ پر ایسا عاشق اور دیوانہ ہوا ہوں کہ تیرے ایک بال پر اُن سب کو قربان کر دوں گا تو اطمینان رکھ کہ کوئی شخص بھی ہو، میں تیرے متعلق اُس کی باتوں کو تنکے برابر بھی اہمیت نہیں دوں گا۔

جب ایک چوتھائی شب گزر گئی اور پہلے پہر کا گھنٹہ بج گیا اور غیر نوبتی ملوک و امرار محل سے چلے گئے تو کلید بردار قاضی ضیاء الدین حسب معمول محل کے اندر گشت لگا کر چوکیداروں اور ہر پہر کے نوبتی عہدہ داروں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اُس وقت قصر کی بالائی عمارت میں سلطان کے خلوت خانے میں خسرو خاں کا ماموں راندھول جو چند برادوں کے ساتھ چھپا ہوا تھا گشت کرتے ہوئے قاضی ضیاء الدین کے پاس گیا اور بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ اُس کی خدمت میں پان کا ایک بیڑہ پیش کیا۔ جس وقت قاضی، راندھول سے پان کا بیڑہ لینے میں مشغول تھا عین اُسی لمحے "جاہریا" نامی ایک برادو نے قاضی ضیاء الدین کے قریب پہنچ کر ایک تیغہ اپنی چادر کے نیچے سے کھینچا اور قاضی پر مارا جس سے وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ قاضی ضیاء الدین کے قتل سے قصرِ ہزار ستون میں شور و غوغا پیدا ہو گیا۔

اب ہزار ستون برادوں سے بھر گیا تھا اور محل کی زیریں منزل پر قدم قدم پر دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ مارنے والوں اور مرنے والوں کی للکاروں اور فغانوں سے ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ جب اس شور و غوغا کی آواز قصرِ ہزار ستون کی بالائی منزل پر پہنچی تو سلطان نے خسرو خاں سے پوچھا کہ یہ کیسا شور ہے جو نیچے ہو رہا ہے۔ اُس زیرک نے اپنے آپ کو بادشاہ کے بازوؤں سے نکالا اور باہر جا کر منڈیر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ عین اُس کی سازش اور اُس

لے بسائے ہوئے دستور اعمل کے مطابق کام ہو رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک وہاں کھڑا اپنے بھائی بندوں اور اپنے قبیلے کے آدمیوں کو چوکیداروں اور پہرہ داروں پر ٹوٹتے ہوئے اور انہیں قتل کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ منڈیر سے پلٹ کر وہ واپس سلطان کے خلوت کدے میں آیا اور ہنس کر کہنے لگا۔ "بڑا دلچسپ کھیل ہے۔ خاصہ کے گھوڑے کھل گئے ہیں اور صحن میں بھاگ رہے ہیں۔ اہلکار اور شاہی اصطبل کے کارندے اُن کو پکڑنے کے لیے اُن کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور شور و غل مچا رہے ہیں۔" سلطان نے اُس کی یہ بات سُن کر پھر اپنی آغوش وا کر دی اور خسرو خاں کو اُس میں لپیٹ لیا۔

عین اُسی وقت جاہریا چند اور برادوں کی معیت میں ہزار ستون کی بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ اُنہوں نے خلوت خانے کے محافظین خاص ابراہیم اور اسحاق کو کلہاڑی کے وار سے موقع پر ہی ٹھکانے لگا دیا اور نعرے مارنے لگے۔ اُن لوگوں کے غلغلے سے سلطان سمجھ گیا کہ بغاوت ہو گئی ہے۔ وہ اُٹھ کر حرم کی طرف بھاگنے لگا تو خسرو خاں مفعول نے اُس کو بالوں سے پکڑ کر اس کے جعدِ مشکیں کو اپنے ہاتھوں پر لپیٹ لیا۔ سلطان نے اُس کو نیچے گرا لیا اور اُس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا، لیکن اُس حرامزادے زیرِ خُسپ نے سُلطان کے بال کسی صورت بھی نہ چھوڑے اور نیچے لیٹا لیٹا جاہریا اور اپنے ماموں راندھول کو آوازیں دینے لگا۔ جاہریا نے فوراً کلہاڑا سلطان کے سینے پر مارا اور اُس کے بال پکڑ کر اُسے برہنہ خسرو خاں سے جُدا کر لیا۔ پھر اُس نے سلطان کو زمین پر گرا دیا اور جلدی سے اُس کا سر کاٹ لیا۔

بہت سے لوگ قصرِ ہزار ستون کی زیریں اور بالائی منزلوں میں اور اُس کی چھت پر برادوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ محل کی بالائی منزل میں تمام برادو لوگ بھر گئے۔ چوکیدار اور محافظ یا تو مارے گئے یا بھاگ گئے۔ برادوں نے چاروں طرف ڈیوٹ روشن کر دیئے۔ قطب الدین مبارک شاہ کے دھڑ کو بالائی منزل سے نیچے پھینک دیا۔ لوگوں نے اُس کو دیکھا اور پہچان لیا۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ کو قتل کرنے کے بعد خسرو کا ماموں راندھول، جاہریا اور خود خسرو خاں مالون سلطان قطب الدین کے حرم میں گھس گئے اور وہاں شاہزادیوں اور حرموں کے ساتھ وہ وہ کچھ کیا جس کے سُنانے کی تاب نہیں۔ اب محل کے اندر اور باہر ہر جگہ

برادوں کا غلبہ تھا۔ اُنھوں نے بہت سی مشعلیں اور بڑے بڑے چراغ روشن کیے اور اُسی وقت دربار مرتب کیا۔ اُس آدھی رات کے وقت اُنھوں نے ملک عین الدین ملتانی، ملک وحید الدین قریشی، ملک فخر الدین جُونا، ملک بہاء الدین دبیر وغیرہ کو اُن کے گھروں سے طلب کیا۔"

یہاں پہنچ کر میں تھوڑی دیر کے لیے رُکا اور لیڈر کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "ملک فخر الدین جُونا کا نام یاد رکھنا۔"

"کیوں؟" اُس نے غصّے سے پُوچھا۔

"اس لیے کہ ہندوستان کے مُسلمانوں میں یہ بھی اہم مقام رکھتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" لیڈر نے تنک کر کہا۔ "ہم نے آج تک اُس کا نام نہیں سُنا۔" دراصل لیڈر کو سُلطان قطب الدین کے قتل کا گہرا رنج تھا اور اُس کے مُنہ سے نارمل بات نہ نکلتی تھی۔

عمّاد نے اپنی ٹھوڑی چھڑی پر سے اُٹھا کر کہا۔ "یار عمر یہ ملک فخر الدین جُونا وہی آدمی ہے جس کو تاریخ محمد تغلق کے نام سے جانتی ہے۔"

"وہی جس نے تانبہ کے سکّوں کو سونے کے سکّوں کی ضرب سے چلایا تھا۔" عظمی نے کہا۔

"یعنی کرنسی نوٹوں کا تصوّر عطا کیا تھا۔"

"جس نے دِلی کے بجائے دکن کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔"

"جس نے چین پر حملہ کیا تھا۔"

"وہ بادشاہ جو اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گیا تھا۔"

"اچھا چلو چلو۔ آگے چلو۔" لیڈر نے رُکھائی سے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟"

مَیں نے کہا۔ "پھر ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ جب اُن سرداروں کو آدھی رات کے وقت برادو لوگ اُن کے گھروں سے نکال لائے اور قصرِ ہزار ستون کی بالائی منزل میں اپنا دربار منعقد کیا تو اندر اور باہر سب حصّے مددوں اور برادوں سے بھر گئے تھے اور خسرو خاں نے مکمّل غلبہ اور قوّت حاصل کر لی تھی۔

جب صبح ہوئی اور آفتاب نکل آیا تو خسرو خاں نے ناصر الدین کا لقب اختیار کیا اور قطب الدین مبارک شاہ کے تخت پر رونق افروز ہُوا۔ اُس ملعون اور مابون نے تخت پر بیٹھتے

ہی حکم دیا کہ سلطان قطب الدین کے اُن چند غلاموں کو جن کے ساتھ سلطان کو خصوصیت تھی اور جو عظیم امرا میں شمار ہوتے تھے گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے؛ چنانچہ اُسی روز اُن میں سے بعض کو تو اُن کے گھروں میں ہی قتل کر دیا گیا اور بعض کو محل میں لا کر اُن کی گردنیں اُڑا دی گئیں۔ ان مسلمان امرا کے بال بچوں، بیویوں اور بیٹیوں کو ہندوؤں اور برادوں کو بخش دیا گیا۔ قاضی ضیاء الدین کا گھر مع مال و اسباب اور اہل خانہ کے اُس نے اپنے ماموں راندھول کے حوالے کر دیا اور قطب الدین مبارک شاہ کی ملکہ کو خسرو خاں نے اپنے گھر میں رکھ لیا۔

تخت نشینی کے پانچ روز کے اندر ہی ان ذلیل اور کمینے لوگوں نے محل میں بُت پرستی شروع کر دی۔ جاہریا کو جس نے سلطان قطب الدین کو قتل کیا تھا موتیوں اور جواہرات سے سجا دیا اور اس کا گھر شاہی خانوادہ کی حرموں سے بھر دیا۔ گندی بغلوں والے بدبودار برادو اور ہندو مسلمان عورتوں اور کنیزوں کو اپنے تصرف میں لانے لگے اور ظلم و زیادتی کی آگ کے شعلے آسمان تک پہنچنے لگے۔ ہندو اور برادو لوگ جن کا غلبہ ہو چکا تھا، دربار میں قرآن شریف کے نسخوں کو کرسیوں کے طور پر استعمال کرتے تھے اور محرابوں میں بُت رکھ کر اُن کی پرستش کرتے تھے۔ اس زیرِ خسرو کے جلوس کے بعد ہندوؤں اور برادوں کے غلبے کی وجہ سے کفر و کافری کا رواج بڑھنے لگا۔ ہندوؤں اور برادوں کو طاقت ور بنانے کے لیے اور ان کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے خسرو خاں بالون نے حکم دیا کہ خزانے کے دروازے کھول دیئے جائیں اور بے دریغ روپیہ تقسیم کیا جائے۔

اس بے دین برادو بچہ کو اب لوگ ناصر الدین کہتے تھے۔ مسجدوں میں منبروں پر اُس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور ٹکسال میں سکے بھی اُسی کے نام کے تیار کیے جاتے تھے۔ اپنے دورِ حکومت میں خسرو خاں اور اُس کے برادو قبیلے کو علائیوں اور قطبیوں کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہ تھا؛ چنانچہ اس گمراہی اور تباہی کے دور میں جب کہ ہندوؤں کے غلبے سے کفر کا رواج بڑھ گیا تھا اور برادوں کی قوت اور شوکت میں اضافہ ہو رہا تھا ہندو آسمان سے باتیں کرنے لگے تھے۔ وہ خوشیاں مناتے تھے اور یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ دہلی پھر ہندوؤں کی ہو جائے گی اور ہندوستان سے مسلمانوں کا جنازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔

خسرو خاں کی بادشاہی اور اُس کے ہندو اور برادو حواریوں کے غلبے کے دوران دہلی اور

مملکت کے دوسرے علاقوں میں مسلمان تین گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ اُن لوگوں کا تھا، جو حرص، طمع، ہوسِ زر اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے خسرو خاں اور اُس کی حکومت کے ساتھ ہوگئے تھے۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جو حکومت سے یا اُن ذلیل اور کمینے متوسلوں سے کوئی وظیفہ یا انعام وغیرہ تو نہیں لیتے تھے، لیکن تجارت اور حرفت کی وجہ سے اُن کے پاس کافی دولت جمع ہوگئی تھی اور وہ اس دولت سے کسی بھی صورت میں جُدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ گو وہ دل سے اُن ملعونوں کے ساتھ نہیں تھے، تاہم وہ اُن کے خلاف کوئی بات بھی نہیں کرتے تھے۔ تیسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا، جو تعداد میں تو بہت کم تھے، لیکن جذبۂ اسلامی کے پیشِ نظر ہر وقت رنجیدہ اور ملول رہتے تھے۔ یہ لوگ پانی تک اچھی طرح سے نہیں پیتے تھے۔ اُن کو نیند بھی ٹھیک طور پر نہیں آتی تھی اور وہ دنیا کے اس خطّہ سے غلامانِ محمدؐ کا وجود مٹ جانے کے خوف سے ہر دم کراہتے رہتے تھے۔

یہ ایک ایسا عہد تھا کہ جس کی نظیر مسلمانوں نے اُس سے پہلے اور کہیں نہیں دیکھی تھی۔ مسلسل دباؤ اور حالات کی نامساعدت سے مسلمان آہستہ آہستہ مرتد ہو رہے تھے اور جو سختی سے اپنے دین پر قائم تھے، اُن کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا۔ گندے بدبُودار اور دُور دراز سے یورش کر کے آنے والے ہندو ہتھیار سجا کر بازاروں میں گھوما کرتے اور مسلمان اُن کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے کوچہ و بازار کی دیواروں کے ساتھ ساتھ لگ کر چلتے اور اُنہیں وقت بے وقت سلام کرتے رہتے۔ اپنے ہی دین کا تمسخر اڑانے کے لیے انہوں نے خود بہت سے لطیفے گھڑ لیے تھے جو وہ برادوں اور ہندوؤں کی محفلوں میں سُنا کر اُن سے داد حاصل کرتے اور اُن کی یگانگت پر فخر کرتے۔

اُس ابتلا کے دَور میں ملک فخرالدین جُونا کو ہمت ہوئی اور اُس کی رگِ حمیت حرکت میں آئی۔ ملک فخرالدین جُونا نے اپنے دلی نعمتوں اور مربیوں کا انتقام لینے کی ٹھانی اور اللہ کا نام لے کر خطرے کے سمندر میں کُود گیا۔ ملک جُونا کا والد ملک غیاث الدین دیپالپور کا حاکم تھا اور اپنے مالک قطب الدین مبارک شاہ کا وفا شعار خادم تھا۔ پنجاب کا پہلا بادشاہ تھا جو بعد میں شہنشاہِ ہندوستان بن کر سریر آرائے سلطنتِ دلی ہوا۔۔۔"

میری اس بات پر میرے ساتھی ایک ساتھ مل کر کڑکڑائے اور سیف الملوک کے راستے پر سوئے ہوئے اصیل مرغوں کی صدائیں ایک ساتھ گونجیں۔

"کچھ عقل کی بات کرو شاہ جی" عماد نے وثوق سے کہا "تغلق خاندان کا یہ فرد پنجاب کا کدھر سے ہو گیا"

"مارو اس کو" مسعود نے خوش ہو کر کہا "اس نے پہلا واقعہ بھی ایسا ہی من گھڑت سنایا ہو گا"

"غیاث الدین تغلق پنجاب کا کیسے ہو گیا تیرا باپ" لیڈر نے کڑک کر کہا۔

میں نے کہا "تم سب لوگ اپنی جگہ پر ٹھیک ہو اور شاید مجھ سے زیادہ ٹھیک ہو، لیکن میں ایک انسان کی فارمیشن میں اس کے ددھیال اور ننھیال اور اس کے ماحول کو برابر کی اہمیت دیتا ہوں۔ غیاث الدین کا باپ سلطان بلبن کا ایک غلام تھا جس نے پنجاب کی ایک جاٹنی سے شادی کی تھی"

"کس سے" عماد نے پوچھا۔

"ساہیوال کی ایک جٹی سے" میں نے کہا "غیاث الدین اس جٹی کے بطن سے پیدا ہوا اور اپنی ماں کے زیرِ سایہ ساہیوال کے علاقے ہی میں پرورش پاتا رہا۔ بعد میں یہی ہونہار اور شیر دل جوان دیپالپور کا حاکم مقرر ہوا جہاں بلبن نے بابا فریدؒ کی خدمت میں اپنی بیٹی کا رشتہ پیش کیا وہاں اسی خانوادے کی طرف سے نوجوان غیاث کو دیپالپور کی حکومت بھی عطا کی گئی"

"کسی تاریخ میں اس کی طرف اشارہ ہے" عماد نے پوچھا۔

"میں اپنے پلّے سے نہیں کہتا" میں نے مسکرا کر جواب دیا "لالہ سجان رائے کی "خلاصۃ التواریخ" کی بات کر رہا ہوں"

اعظمی نے کہا "ناں بھائی۔ مجھے پریشان نہ کرو۔ باوجود اس کے کہ میں پنجاب کی اس ماں کی عزت کرتا ہوں اور غیاث الدین کی جاٹنی والدہ کو سلام کرتا ہوں۔ پھر بھی تم لوگ اپنا بادشاہ رنجیت سنگھ ہی کو مانو۔ ہندوستان کے جلیل القدر شہنشاہوں کی صف میں قدم نہ رکھو"

مفتی نے کہا LEGACY اور ESTATE سسٹم تو بدلتے رہتے ہیں۔ بدلتے رہے